مکتوبات مفکر اسلام سیّد ابوالحسن علی ندویؒ پر ایک نظر

ڈاکٹر سفیر اختر ☆

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (م ۱۹۹۹ء)، ماضی قریب کے صاحبِ فکر علمائے دین میں سے تھے۔ ان کی تحریریں، جتنی برصغیر کے اُردو قارئین میں متداول ہیں، غالبًا اتنی ہی، یا اس سے کچھ زیادہ متداول عرب دنیا میں ہیں۔ انہوں نے اردو اور عربی میں بیک وقت لکھا، اگر ایک تحریر اردو میں لکھی تو ان کے عزیزوں نے اسے عربی میں منتقل کر دیا، اور اسی طرح جب انہوں نے عربی میں قلم اٹھایا، تو اس کا ترجمہ ہاتھوں ہاتھ اردو میں ہو گیا۔ ان کی قابل ذکر کتابوں میں سے، جو اُن کی پہچان ہیں، بہت کم ایسی ہوں گی جو اردو اور عربی دونوں زبانوں میں دستیاب نہ ہوں۔ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے مولانا ندوی کو جو اشاعتی وسائل دیے تھے، ان کے طفیل ۱۹۷۰ء کے بعد شاید ہی ان کی کوئی تحریر، تقریر یا بیان چھپنے سے رہ گیا ہو، تاہم ''مکتوبات'' (اور بالخصوص نجی نوعیت کے مکتوبات) ایسی تحریریں ہیں جو لکھنے والے کی عظمت و بزرگی کے باوجود کچھ عرصے تک عام آدمی کی نظروں سے اوجھل رہتی ہیں، اوران کا ایک حصہ ضائع بھی ہو جاتا ہے۔

مولانا ندوی نے اہل قلم، اعزہ و احباب اور مستفسرین کو بلاشبہ سیکڑوں مکتوبات لکھے ہوں گے، ان میں سے مدیرانِ جرائد کو لکھے گئے مکتوبات، اپنے علمی و دینی مندرجات کے باعث ساتھ ساتھ جرائد میں شائع ہوتے رہے۔ ان کے علاوہ مولانا ندوی کے مکتوبات کا ایک مختصر سا مجموعہ ''مکاتیب یورپ'' (لکھنؤ: مکتبۂ اسلام، س - ن) ان کی زندگی میں شائع ہوا۔ رحلت کے بعد ان کی یاد میں چھپنے والی تحریروں میں ان کے متعدد نئے مکتوبات سامنے آئے، یا ادھر اُدھر بکھرے ہوئے مکتوبات یک جا کیے گئے۔ دو مستقل بالذات مجموعے، ایک ہندوستان سے، اور دوسرا پاکستان سے بالترتیب مولانا عبدالکریم پاریکھ اور مولوی فضل ربی ندوی کے نام مکتوبات پر مشتمل شائع ہوئے ہیں۔ ''مکتوباتِ مفکر اسلام سید ابوالحسن علی ندوی''، جس کی پہلی جلد ہندوستان اور پاکستان، غالبًا دونوں ملکوں سے شائع ہوئی ہے، اس سلسلے کی تازہ ترین کاوش ہے۔

☆ چیف ایڈیٹر، ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

اس آخر الذکر مجموعے کے مرتب جناب سید محمد حمزہ، مکتوب نگار کے بھانجے مولانا محمد ثانی حسنی کے صاحبزادے ہیں، انہوں نے مکتوبات کی جمع و ترتیب کا آغاز مولانا ندوی کی زندگی میں کر دیا تھا، تاہم وہ زیرِنظر جلد کی ترتیب و تدوین سے مارچ ۲۰۰۲ء میں فارغ ہوئے۔ اس جلد میں مکتوب نگار کے افرادِ خاندان ـــــ ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی (برادرِ بزرگ)، حکیم سید حسن مثنیٰ ندوی امروہوی، سید ابوبکر حسنی ـــــ، ایک بزرگ کرم فرما مولانا محمد زکریا کاندھلوی، اور احباب ـــــ مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا عبدالسلام قدوائی اور مولانا محمد ناظم ندوی ـــــ کے نام ۱۴۶ مکتوبات شامل ہیں۔ آخر میں ''مکاتیبِ یورپ'' کو ان کی ''علمی، تاریخی اور ادبی اہمیت کے پیشِ نظر'' نقل کر لیا گیا ہے (صفحات ۲۹۱ - ۳۲۰)۔ زمانی اعتبار سے یہ مکتوبات اکتوبر ۱۹۳۵ء سے جولائی ۱۹۸۴ء کے تقریباً پچاس سالہ عرصے پر محیط ہیں، دوسرے لفظوں میں اس مجموعے میں مکتوب نگار کا ایسا مکتوب بھی ہے جو اس نے ۲۲ سال کی عمر میں لکھا تھا اور ایسے مکتوبات بھی ہیں جب اس کے قلم میں پختگی اور فکر و دانش میں گہرائی آ چکی تھی۔ مولانا محمد زکریا کاندھلوی اور مولانا محمد منظور نعمانی کے دیوبندی پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے دیکھا جائے تو ان سے قطع نظر باقی سب ہی مکتوب الیہم دارالعلوم ندوۃ العلماء - لکھنؤ کے فاضل ہیں، یا بصورتِ دیگر اس سے وابستہ ہیں۔

مرتب مکتوبات نے ہرمکتوب الیہ کے نام جملہ مکتوبات تاریخ وار یک جا کیے ہیں، اس طریقِ ترتیب و تدوین میں یہ خوبی پائی جاتی ہے کہ مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے باہمی تعلقات و روابط اور دلچسپیوں کے اشتراک کی موضوعاتی وحدت قائم رہتی ہے، اور تعلقات کا پس منظر قاری کے ذہن میں رہتا ہے، تاہم ایک ہی تاریخ میں مختلف افراد کو ایک ہی موضوع پر لکھے گئے مکتوبات ایک دوسرے سے دور جا پڑتے ہیں۔ یہ خوبی اور خامی دوسرے مجموعہ ہائے مکتوبات کی طرح اس مجموعۂ مکتوبات میں بھی موجود ہے۔

''مکتوباتِ مفکر اسلام ---'' کا صرف ایک خط ۱۹۳۵ء کا مرقومہ ہے جس میں مکتوب نگار نے اچھوت رہنما ڈاکٹر امبیدکر سے ملاقات کر کے انہیں اسلام کی دعوت دینے کا ذکر کیا ہے (صفحات ۹ - ۱۱)، پھر ۱۹۳۹ء سے مارچ ۱۹۴۴ء تک کے مکتوبات میں ''سیرت سید احمد شہیدؒ''(اولیں اشاعت: ۱۹۳۹ء) میں ترمیم و اضافہ کے لیے مشورے، یا سید احمد شہید کی جولاں گاہ، خطۂ پشاور کے سفروں کا تذکرہ ہے۔ اس موضوع سے حکیم سید حسن مثنیٰ ندوی کو بالخصوص دلچسپی تھی، چنانچہ اُن کی طرف سے

بعض تسامحات کی نشاندہی پر اُنہیں لکھا گیا ہے:

٭ ''مجھے --- سخت افسوس ہے کہ کتاب تیار ہو گئی، اور طباعت سے پہلے آپ کی نظر سے نہیں گزری۔ --- آپ پوری کتاب اصلاح کی نظر سے ملاحظہ فرمائیں اور ایسی تمام غلطیوں کی ایک فہرست بنا دیں، تاکہ اگر نوبت آئی تو دوسری اشاعت میں ان کی اصلاح ہو جائے'' (ص ۲۱۸)۔

٭ ''سیرت سید احمد شہید کے مطبوعہ نسخے قریب الختم ہیں اور دوسرے ایڈیشن کی تیاری کر رہا ہوں۔ --- زحمت فرما کر کتاب پر ایک نظر اور ڈال لیجیے اور جن مقامات میں آپ کوئی اصلاح یا تبدیلی و تکمیل چاہتے ہیں، ان سے مطلع فرمایئے ---'' (ص ۲۱۹)۔

٭ ''[''سیرت سید احمد شہید'' کے] بعض مضامین مستقل لکھنے ہیں، خاندان کا حصہ بھی اچھا خاصا بڑھانا ہے۔ خدا جناب کو جزائے خیر دے کہ میرا تقریباً تمام بار ہلکا کر دیا، پھر بھی کچھ نہ کچھ لکھنا ہے، تمام کتاب پر اپنے ملحوظات لکھ کر ضرور بھیجیے'' (ص ۲۲۰)۔

مارچ ۱۹۴۴ء میں مولانا ندوی نے ضلع پشاور کے ان علاقوں کا سفر کیا جو تحریکِ مجاہدین کا مرکز تھے، اور اسی زمانے میں مولانا غلام رسول مہر (م ۱۹۷۱ء) تحریکِ جہاد پر کام کر رہے تھے، جن کا مولانا ندوی سے مستقل رابطہ تھا۔ حکیم سید حسن مثنیٰ ندوی کے نام مکتوبات میں ان کا ذکر آتا ہے۔ '' سیرت سید احمد شہید'' کا دوسرا ایڈیشن چھپ گیا (۱۹۴۱ء)، مگر تسامحات سے کلیۃً پاک نہ تھا، جون ۱۹۴۶ء میں تیسراایڈیشن زیر کتابت تھا۔ لکھا گیا ہے: ''میری خواہش تھی کہ اشاعت سے پہلے آپ کی نظر پڑ جاتی۔ اس مرتبہ اس میں تسامحات نہ رہ جائیں تو اچھا ہے'' (ص ۲۲۵)۔ کتاب کی دوسری اشاعت پر حکیم سید حسن مثنیٰ ندوی اور مولانا مہر نے ملاحظات بھجوائے، جنہیں پیش نظر رکھا گیا (ص ۲۳۳)، چنانچہ جب تیسرا ایڈیشن تیار ہوا تو بقول مولانا ندوی، ''پہلی دو اشاعتوں کو کمیت و کیفیت دونوں میں اس سے کوئی نسبت نہیں'' تھی (ص ۲۲۹)۔

''سیرت سید احمد شہید'' کے تیسرے ایڈیشن کے لیے ابھی مناسب ناشر کی تلاش جاری تھی کہ مولانا مہر کی کتاب ''سید احمد شہید'' (اولیں اشاعت: ۱۹۵۳ء) تقریباً ایک ہزار صفحات پر شائع ہو گئی۔ مولانا ندوی کے تأثرات یہ تھے:

> ''سید احمد شہید'' کے متعلق آپ کے تأثرات صحیح ہیں، بڑی مستند و محققانہ کتاب ہے، جزاہ اللہ خیراً، البتہ کئی جگہ اب مزید تحقیق سے استدراک کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ان شاء اللہ ہماری کتاب کی نئی اشاعت سے آپ کو اندازہ ہو گا، بعض نادر قلمی تحریریں مل گئیں جن

سے سنین کے تعین اور بعض نظریات میں انقلاب ہو گا۔ ایک عمدہ چیز نصیر آباد [رائے بریلی سے تیس کلومیٹر جانب مشرق واقع ایک تاریخی قصبہ، جہاں سید احمد شہید کا خاندان رائے بریلی آنے سے قبل آباد تھا] میں ابھی ملی، [سید احمد کے] سفرِ حج کی ڈائری جس میں بقیدِ تاریخ واقعات ہیں، اسی طرح بعض اور تاریخی وثائق ---" (ص ۲۴۱)۔

اکتوبر ۱۹۴۴ء اور اس کے بعد کے مکتوبات میں تبلیغی اسفار کا تذکرہ شروع ہو جاتا ہے (صفحات ۱۴ - ۲۳)۔ ۴۵ - ۱۹۴۴ء میں تبلیغی سلسلے میں مولانا ندوی کا قیام راولپنڈی اور ہری پور کے اضلاع میں رہا۔ اس علاقے کے اہلِ علم، ان کے خانوادوں اور مدارس کے بارے میں برادر بزرگ ڈاکٹر سید عبدالعلی کے نام اطلاع دیتے رہے: λ "کل اور پرسوں [۱۱ - ۱۲ جولائی ۱۹۴۴ء] شام کو ایک نہایت صحیح الخیال موحد عالم مولانا غلام اللہ خان صاحب خلیفہ مولانا حسین علی صاحب نقشبندی سے (جو اس پورے علاقہ میں توحید کی دعوت کے علم بردار ہیں، اور حضرت سید صاحب [سید احمد شہید] کے نہایت معتقد و قائل ہیں) تبادلۂ خیال رہا، جو ہماری مسرت اور ان کی طمانیت کا باعث ہوا" (صفحات ۱۸ - ۱۹) λ "یہاں [ہری پور] خواجہ عبدالرحمٰن صاحب مشہور قادری بزرگ جو اس نواح کے بڑے مقبول شیخ تھے، کا قائم کیا ہوا مدرسہ رحمانیہ ہے جو پورے صوبہ سرحد کا سب سے بڑا دارالعلوم ہے" (ص ۱۹) λ "ضلع کیمبل پور تحصیل اٹک میں بھوئی ایک مقام ہے جس کا درس بہت پرانا اور بہت مشہور ہے، پنجاب کے بڑے بڑے مشائخ (مثلاً پیر مہر علی شاہ گولڑہ والے) اور علماء یہاں کے شاگرد ہیں۔ اس کی حیثیت یہاں فرنگی محل کی سی ہے، وہاں اس وقت بزرگوں کے جانشین مولانا حکیم عبدالحی صاحب ہیں--- ان کی حیثیت اس نواح میں شیخ الاسلام کی سی ہے" (ص ۲۱)۔

۱۳۶۶ھ/ ۱۹۴۷ء میں مولانا ندوی نے اپنی والدہ ماجدہ اور بہن سیدہ امۃ اللہ تسنیم کے ساتھ پہلا سفرِ حج کیا۔ اس سفر کے جذب و کیفیت پر مولانا کا مضمون "اپنے گھر سے بیت اللہ تک" خاصے کی چیز ہے، تاہم اس حوالے سے زیرِنظر مجموعے میں کئی مکتوبات ہیں (صفحات ۲۴ - ۳۸، صفحات ۱۵۰ - ۱۷۲، صفحات ۱۹۷ - ۱۹۹، صفحات ۲۱۴ - ۲۱۷)۔ اس سفر کے تأثرات و مشاہدات میں متعدد امور نمایاں ہیں۔ عرب دنیا کے اس پہلے سفر میں مولانا ندوی کو عربی زبان و انشاء میں اپنی مہارت کا عملی ثبوت ملا: λ "ہمارا رسالہ الی ممثلی البلاد الاسلامیہ --- یہاں بحمدللہ علماء و ادباء میں بہت مقبول ہو رہا ہے۔ ایک بڑے مصری مدرس نے مسجد نبویؐ کے ایک حلقہ میں پڑھ کر سنایا اور اس کی ادبیت و عربیت اور مضامین کی صحت کی داد دی" (ص ۳۰) λ "عربی زبان کو ایک زندہ زبان کے طور پر خاص دعوت کے مقصد سے حاصل کرنا اعظم قربات میں سے ہے اور اس کے بغیر موجودہ استعداد سے دعوت کا کام

کرنا بہت دشوار ہے۔ --- اگر ہمیں [شیخ خلیل] عرب صاحب اور [تقی الدین] ہلالی صاحب جیسے استاد نہ ملتے اوران کی شروع سے توجہ و عنایت نہ ہوتی تو یہ کام بہت مشکل تھا'' (ص ۴۸)۔

سفر حجاز میں مولانا ندوی کے پاس شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی ''جذب القلوب الی دیار المحبوب'' کا نسخہ تھا، ان کے بقول ''اس کے مطالعہ سے بڑا حظ اور کیف حاصل ہوتا ہے، خصوصاً حاضری مدینہ طیبہ کا باب تو انہوں نے بڑے کیف و سرور میں لکھا ہے'' (ص ۱۵۱)۔ دورانِ سفر میں انہوں نے ارادہ کیا کہ ''زادالمعاد'' (حافظ ابن قیم الجوزیہ) کی تلخیص مسجد نبوی میں بیٹھ کر اس طرح کریں کہ علمی تحقیقات اور اختلافی مسائل سے ہٹ کر شمائل و عادات اور اخلاق ومعاملات کی تجرید کر لیں (صفحات ۱۵۱ - ۱۵۲)، مولانا ندوی نے یہ کام شروع بھی کر دیا تھا، اور سفرِ حجاز سے واپسی تک ''خیرالزاد'' مکمل کر لینے کی آرزو رکھتے تھے (ص ۲۱۷)، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ (''زادالمعاد فی ھدی خیرالعباد'' کی اہمیت کے پیشِ نظر ۱۹۲۰ء کی دہائی میں اس کی تلخیص ایک مصری عالم شیخ محمد ابو زید نے ''ھدی الرسول'' کے نام سے کی تھی جس کا ترجمہ — ''اسوہ حسنہ'' — عبدالرزاق ندوی ملیح آبادی نے کیا، جو متداول ہے)۔

اس سفر میں ان کی احساساتی کیفیت کیسی تھی؟ ان ہی کے الفاظ میں ''اس پاک سرزمین کے ساحل پر پہنچ کر الحمدللہ وہی خوشی ہوئی، اور بوئے انس آئی جو برس ہا برس کے پردیسی کو وطن کے قریب پہنچ کر آتی ہے، ناخوشگواری اور وحشت کا کیا اثر، ہر چیز میں دل آویزی اور محبوبیت معلوم ہوتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی تک ہم آوارہ پھرتے رہے، اب اپنے ٹھکانے پر آئے ہیں۔ ہر چیز آشنا اور مانوس معلوم ہوتی تھی'' (ص ۱۵۲)۔ ''جس قدر مدینہ طیبہ کے قریب کی منزلیں آ رہی تھیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی دل کو گدا گدا رہا ہے، مجھے یاد نہیں کہ مدت سے ایسی خوشی اور لذت حاصل ہوئی ہو، کبھی جوش سے، کبھی ذوق سے عربی، فارسی اور اردو کے اشعار پڑھتا تھا ---'' (ص ۱۵۳)۔

اس ذاتی والہانہ کیفیت کے ساتھ مسافرِ حجاز نے مقامی آبادی میں، گو عربی خصائل، ترحیب واکرام، سادگی اور انقیاد للحق کے مناظر بھی دیکھے، مگر آبادی کی دینی زبوں حالی اور جہالت اس کی طبیعت کو منغض کر دینے کے لیے کافی تھی: ''بعض مقامات پر جو مدینہ سے زیادہ فاصلہ پر نہیں ہیں، بدو جو قدیم قبائل بنی تمیم، مزنہ، جہینہ وغیرہ کی نسل میں ہیں، مردوں کو بغیر نماز کے دفن کر دیتے ہیں، اس لیے کہ نماز پڑھانے والا کوئی نہیں۔ سورۂ فاتحہ میں غلطیاں عام ہیں۔ بعض بعض سورتوں میں عربی عبارتوں کے الحاق کر رکھے ہیں، بعض آیات کے عربی ترجمے بے تکلف قرآن کی طرح پڑھ دیتے

ہیں'' (ص ۳۲)۔ اس کے ساتھ حد درجے کا افلاس دیکھ کر جہاں مسافر حجاز کڑھتا ہے، وہیں توجہ دلاتا ہے: ''اگر اہلِ خیر کچھ رقوم یہاں کے مستحقین اور لایسئلون الناس الحافا کی صفت رکھنے والے شرفاء کے لیے بھیجیں تو بہترین موقع ہے'' (ص ۳۱)۔

ارضِ حجاز میں مولانا پر یہ امر بھی واضح ہوا کہ ''اس گئی گزری حالت میں بھی اس امت کو اپنے اللہ سے جو تعلق ہے اور اس کے عوام کو جو تعلق ہے، وہ کسی قوم کے بڑے بڑے صوفیوں کو نصیب نہیں، اس کو اگر دیکھنا ہو تو ملتزم پر دیکھنا چاہیے --- دن اور رات عجیب حالت ہوتی ہے۔ بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے والوں سے ملتزم شریف شاید کسی وقت خالی ہوتا ہو --- (ص ۱۶۸)۔ ایک اور تأثر: ''دشمنانِ اسلام بالخصوص مستعمرین مغرب سے بغض میں تمام مسلمان قومیں ہندوستانی مسلمانوں سے فائق ہیں، اسی طرح طبیعت کی سلامتی اور دینی فہم میں بھی بیرونی مسلمان ہمارے ملک کے مسلمانوں سے ممتاز ہیں'' (ص ۱۶۸)۔

سفر حجاز کے دوران میں مولانا ندوی کی توجہ خصوصی طور پر ترک حجاج کرام نے حاصل کی: ''خاص بات یہ ہے کہ ترکی سے حجاج بھی آنا شروع ہو گئے ہیں، حج کے نام سے تو اجازت نہیں ملی، مگر تجارت کے نام سے آ رہے ہیں'' (ص ۲۹)۔ مولانا ندوی ترکی میں دینی بیداری کا خاص طور پر ذکر کرتے ہیں (صفحات ۳۲ - ۳۳)، مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی سے ''سرگوشی'' میں کہتے ہیں:

> دو چیزوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ایک وہ کام جو آپ کا ادارہ [تعلیماتِ اسلام - لکھنؤ] کر رہا ہے، [یعنی قرآنی عربی کی تعلیم و تدریس]، اور اس سے زیادہ وہ، جو اب کرنا چاہتا ہے یعنی عربی کا نیا مدرسہ، دوسرے وہ کام جو مولانا ابوالاعلیٰ صاحب نے چند سال پہلے کیا تھا، اور اس سے پہلے کچھ مختلف طرز پر دارالمصنفین نے کیا، یعنی نئے دینی ادب و کلام کی ترتیب اور ''سیرۃالنبیؐ''، ''الفاروق''، ''خطباتِ مدراس'' وغیرہ، اور ''تنقیحات''، ''تفہیمات''، ''پردہ''، ''اسلام کا نظام [کذا، نظریۂ] سیاسی'' وغیرہ وغیرہ جیسی کتابوں کی تالیف۔ اگر ترکی میں کچھ مردانِ غیب ایسے پیدا ہو گئے تو اس صاحب تاریخ قوم کا رخ فوراً بدل جائے گا، اور الحمدللہ بدلنا شروع ہو گیا ہے'' (ص ۱۹۹)۔

مولانا ندوی کو پہلے سفر حج کے تین برس بعد دوبارہ ستمبر ۱۹۵۰ء/ ۱۳۶۹ھ میں اپنے پیر ومرشد مولانا عبدالقادر رائے پوری کی معیت میں ارضِ حجاز جانے کا موقع ملا۔ اس سے پہلے اُن کی معروف تالیف ''ما ذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' قاہرہ سے شائع ہو چکی تھی، جسے عرب دنیا کے علمی

اور دینی حلقوں میں پذیرائی حاصل ہوئی تھی۔ عرب دنیا سے اس تعلق، نیز وہاں کی دینی تحریکات کے براہ راست مطالعے کی غرض سے مولانا نے مناسب خیال کیا کہ مصر، سوڈان اور شام کا دورہ بھی کیا جائے، چنانچہ یہ سفر ایک موسم حج سے دوسرے موسم حج (۱۳۷۰ھ) پھیل گیا۔ اس عرصے میں اُنہوں نے اپنے اعزہ و احباب کو جو مکتوبات لکھے، وہ ''سفرنامے'' کے قبیل سے ہیں (صفحات ۴۲ - ۱۲۶، ۱۷۲ - ۱۸۷، ۱۹۹ - ۲۱۴)۔ اس سفر کی ڈائری بہ زبان عربی ''مذکرات سائح فی الشرق العربی'' کے نام سے شائع ہوئی تھی جسے مرحوم مشیرالحق بحری آبادی نے 'شرق اوسط میں کیا دیکھا؟'' (لکھنؤ: مکتبہ تعلیمات اسلام، جنوری ۱۹۵۳ء) کے نام سے اردو میں منتقل کر دیا تھا۔

مولانا کے بقول ''اس سفر میں [انہیں] حضرت [رائے پوری] کی جتنی معیت اور قرب حاصل ہوا، اتنا نہ کبھی حاصل ہوا، نہ اس کا موقع تھا۔ اسی قرب و رفاقت سے حضرت کے مقام کی بلندی، مقبولیت اور اندرونی جذب و شوق، لیکن انتہائی ضبط و تمکین کا انکشاف ہوا۔ --- یہاں آ کرمعلوم ہوا کہ ان حضرات کو بارگاہ نبوی سے ہی تعلق ہے، اور یہ ذوق سب پر غالب ہے، مجھے اتنا اندازہ نہ تھا، جو اوقات مواجہ شریف کے قریب، یا حرم شریف کے اندر گزرے ہیں، وہ سرمایۂ زندگی ہیں'' (ص۱۷۶)۔

ارضِ حجاز میں اپنے اس قیام کے دوران میں ان کے بعض تأثرات تو من و عن وہی تھے جن کا اظہار انہوں نے پہلے سفر حج کے موقع پر کیا تھا، مثال کے طور پر''اس گئے گزرے زمانہ میں بھی اس امت کو اللہ کا نام لینے، اس سے براہ راست مانگنے، ہاتھ پھیلانے اور اس کا ذکر کرنے کی جتنی توفیق ہے، اس کا ہزارواں حصہ بھی بلا مبالغہ کسی قوم کو نصیب نہیں۔ ---'' (ص ۱۷۶)، یا ترکی اور ترکوں کے بارے میں ان کے تأثرات ہیں (ص ۱۷۸)۔ اس کے ساتھ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۰ء تک، تین برسوں میں آنے والی تبدیلی کا ذکر بھی کرتے ہیں:

> ۴۷ء میں ہم پہلی بار آئے تھے، اب ۵۰ء ہے، ان تین برسوں میں کھلا ہوا تغیر محسوس ہوتا ہے، بازار سے لے کر لوگوں کے دماغوں تک مغربی تمدن، تجارت و معاشیات اور افکار و خیالات کے پنجے اور زیادہ گڑ چکے ہیں، جدہ اترتے ہی اس کا احساس ہوتا ہے اور جس قدر حالات سے واقفیت ہوتی ہے، اتنا ہی اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ خوبصورت عربی لباس میں کتنے دل اور دماغ مغربی بن چکے ہیں، اور قرآنی زبان کتنے مغربی خیالات اور خالص مادی نفسیات کا ذریعۂ اظہار بنتی ہے۔ معاش کا انہماک، دولت آفرینی، عزت طلبی، بحرانی حد تک پہنچ گئی ہے۔ زندگی کا تصور اس کے بغیر ممکن نہیں

کہ امریکہ کے سایہ میں پناہ لی جائے اور ترقی کی جائے۔ عالمِ اسلام کا قبلہ تو مکہ معظمہ اور بیت اللہ ہے، اور مرکزِ اسلام کا قبلہ امریکہ ہے۔ وبائے عام کی طرح اس کا اثر فضا اور ہوا میں ہے۔ --- (صفحات ۵۴ -۵۵)۔

مولانا کے وجدان و دانش کا فتویٰ یہ تھا کہ اگر دینی تفہیم و دعوت کا مناسب انتظام نہ ہو سکا تو سعودی عرب ''ایک نئے اخلاقی و ذہنی سانچہ میں ڈھل جائے گا'' (ص ۷۴)۔

مولانا سعودی عرب سے مصر جانا چاہتے ہیں، مگر بحری جہاز کی روانگی کا کوئی اتا پتا نہیں۔ اس حال میں لکھتے ہیں:

مکہ معظمہ میں جو دن گزرتا ہے، غنیمت، بلکہ نعمت معلوم ہوتا ہے، قطعاً یہاں سے جانے کا جی نہیں چاہتا، جدہ اور طائف میں دونوں جگہ تجربہ ہوا، طبیعت یکساں نہیں رہتی، کچھ توحش محسوس ہوتا ہے، کبھی بے کیفی و بدمزگی، لیکن یہاں وحشت کا کیا ذکر، اسبابِ انس سب جمع ہیں، روحانی بھی حسی بھی، ان اسباب اُنس کا سب سے بڑا مرکز، بلکہ اصل مرکز حرم شریف ہے، جہاں برکت، سکینت، فضیلتِ طواف و عبادت، اور شہر کے تمام اہل علم وفضل، مفسرین، محدثین، ادباء، خطباء سب مل جاتے ہیں، خصوصاً مغرب سے عشاء تک کا وقت خاص رونق و بہار کا ہوتا ہے۔ --- (صفحات ۲۰۸ - ۲۰۹)۔

مصر کے حوالے سے لکھا گیا ہے کہ ''اس کی وسعت و اہمیت دیکھتے ہوئے یہ مستقل کام تھا کہ یہاں کی دینی تحریکات اور جمعیتوں کا کچھ دنوں مطالعہ کیا جائے'' (ص ۱۸۲)، چنانچہ انہوں نے یہاں کی قابل ذکر دینی تحریکوں اور جماعتوں ـــ الاخوان المسلمون، شباب سیدنا محمد، الجمعیۃالشرعیہ، جماعت انصارالسنہ ـــ کا مطالعہ کیا، ان کے رہنماؤں سے ربط ضبط پیدا کیا، اور ان کے بارے میں اُردو قارئین کو اپنے حاصلِ مطالعہ میں شریک کیا۔ مصر کے بارے میں مولانا ندوی کے تأثرات بہت دلچسپ ہیں۔ مولانا محمد منظور نعمانی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

پنجاب سے اس کا قومی مزاج بہت کچھ ملتا ہے اور آپ پنجاب کے مزاج سے خوب واقف ہیں۔ انجمنوں اور تحریکات سے یہ ملک بھرا ہوا ہے، ہر تحریک و دعوت کی گنجائش موجود ہے، لوگ بڑے زندہ دل اور پُرجوش ہیں، خیرو شر دونوں کی کمی نہیں، صحافت و اشاعت، طباعت، خطابت، فراوانی سے موجود ہیں، شر کی جو مقدار موجود ہے، وہ شاید کسی اسلامی ملک میں نہ ہو، لیکن خیر کی بھی جو مقدار ہے، شاید وہ بھی کسی اسلامی ملک

میں اس وقت آسانی سے نہ پائی جائے۔ تناقضات ہر جگہ ملتے ہیں، بڑی سے بڑی روشن خیالی اور راسخ سے راسخ دینداری دوش بدوش ہیں'' (ص ۱۸۳)۔

بعد میں جب جمال عبدالناصر نے الاخوان المسلمون پر پابندی عائد کرتے ہوئے اس پر پہلا وار کیا (دسمبر ۱۹۵۴ء)، اور اس کے صفِ اول کے رہنماؤں کو دار پر کھینچ دیا تو مولانا نے لکھا: ''اخوان کی تحریک ان شاء اللہ فنا نہیں ہو گی'' (ص ۲۳۹)۔ دوبارہ ۱۹۶۵ء میں الاخوان المسلمون اور اس کی قیادت ناصر کے ظلم وستم کا نشانہ بنی، مگر جب ناصر کا انتقال ہوا تو اس کے ظلم وستم کے باوجود اہل مصر نے غم والم کا زبردست مظاہرہ کیا۔ اس صورتِ حال پر مولانا ندوی کا تأثر یہ تھا: ''دنیا میں احمقوں اور فریب خوردہ لوگوں کا تناسب ۹۹ فیصدی ہے اور مصریوں کا مزاج تم کو معلوم ہے۔ اگر یہ مزاج نہ ہوتا تو فرعون کبھی اتنا کامیاب نہ ہوتا۔ انڈین اکسپریس کے مقالہ نگار نے صحیح لکھا ہے کہ وہ اپنے اس عصر کا فرعون تھا'' (ص ۲۷۶)۔

''ما ذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' نے مصر، سوڈان اور شام میں مولانا ندوی کے نادیدہ عقیدت مندوں کا ایک بڑا حلقہ پیدا کر دیا تھا، چنانچہ دینی حلقوں میں ان کی خوب پذیرائی ہوئی، اور وقت کی چوٹی کی دینی قیادت سے ان کے تعلقات استوار ہوئے۔ اُنھوں نے متعدد اجتماعات سے خطاب کیا، اُن کے اعزاز و اکرام میں مجالس منعقد ہوئیں، ریڈیو سے تقاریر کی دعوت ملی، دورانِ سفر میں اُن کی تحریریں شائع ہوئیں (ص ۹۸)، اور ''ما ذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' کی دوسری اشاعت کا سامان ہوا (ص ۱۲۵)۔

شام کے سفر میں ان کی ملاقات معروف عالم دین، اخوان المسلمون کے صدر اور کلیۃ الشریعہ - دمشق کے پرنسپل شیخ مصطفیٰ السباعی (م ۱۹۶۴ء) سے ہوئی تھی، انہوں نے اپریل - مئی ۱۹۵۶ء میں مولانا ندوی کو جامعۃ السوریہ میں بطور استاذِ زائر (وزیٹنگ پروفیسر) بلا بھیجا۔ دمشق کے دورانِ قیام میں جو مکتوبات لکھے گئے، ان میں جہاں لیکچرز (محاضرات) کا ذکر ہے، وہیں دمشق اور اہلِ دمشق کا تذکرہ ہے۔ ترکی کی سیاحت مولانا کی دیرینہ آرزو تھی، وقت اگرچہ تنگ تھا، مگر ۱۹۵۶ء کے اس سفر کے دوران میں دو ہفتے کے لیے ترکی ہو آئے، جس کا روزنامچہ ''دو ہفتے ترکی میں'' (کراچی: مجلسِ نشریات اسلام، ۱۹۹۲ء) کے نام سے ملتا ہے (دیکھیے: صفحات ۱۳۲ - ۱۳۴، ۱۸۷ - ۱۹۷، ۲۴۶ - ۲۴۷)۔ اہلِ دمشق کے بارے میں لکھا گیا ہے: ''یہاں کے لوگوں کے اخلاق ہم ہندوستانیوں کے لیے قابلِ تقلید، بلکہ قابلِ عبرت ہیں، بڑے سے بڑا آدمی اس تواضع سے ملتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے، علماء

نے عموماً ملاقات میں سبقت کی اور بار بار آئے، دیر میں آنے کی ان الفاظ میں معذرت کی کہ شرمندگی ہوئی۔ واقعہ یہ ہے کہ عرب اپنے اخلاق میں ابھی تک ممتاز ہیں، اور فراخ حوصلگی ان کا حصہ ہے'' (ص ۲۴۶)، مگر اس علوِ اخلاق کے ساتھ ''مغربی تہذیب من حیث القوم تسلیم کر لی گئی ہے'' (ص ۱۸۹)۔

۱۹۵۶ء کے اس غیر ملکی سفر کے بعد دسمبر ۱۹۶۰ء میں مولانا کو رنگون (میان مار) جانے کا موقع ملا۔ رنگون کے مہینہ ڈیڑھ کے قیام میں لکھے گئے تین مکتوب اس مجموعے میں شامل ہیں۔ برادر بزرگ ڈاکٹر سید عبدالعلی کو اپنے استقبال کے بارے میں بتاتے ہیں: ''اخبارات میں چھپا ہے کہ آزاد برما میں (کسی عالم) کا اس سے پہلے ایسا استقبال نہیں ہوا'' (ص ۱۴۵)، نیز ''دیوبند و مظاہر علوم، بالخصوص مظاہر علوم کے فارغین کی یہاں معقول تعداد ہے اور ان حضرات نے بڑا استقبال کیا ہے، ندوی فضلاء زیادہ تر اراکان کے علاقہ کے ہیں، جو یہاں [رنگون] سے تین چار سو میل دور ہے'' (ص ۱۴۶)، مزید براں ''اس ملک میں مسلمانوں کی تعداد ۱۸ لاکھ سے کم نہیں، بعض ۲۰ لاکھ کہتے ہیں۔ صرف رنگون میں دو لاکھ کے قریب مسلمان بتائے جاتے ہیں۔ مساجد نہایت بارونق اور آباد ہیں۔ —— افسوس ہے کہ علماء اور دینی جماعتوں میں انقلاب شروع ہو گیا ہے جس کا اثر عوام پر اچھا نہیں پڑتا۔ دو اسلامی ادارے ایک دوسرے کے مقابل ہیں، دو اردو روزنامے نکلتے ہیں، وہ ایک دوسرے کے مخالف ہیں، علماء کا اثر کم ہوتا جا رہا ہے'' (ص ۱۴۸)، اس سے ذرا مختلف انداز میں ۱۶ جنوری ۱۹۶۱ء کے مکتوب میں سید ابوبکر حسنی کو لکھتے ہیں: ''رنگون کے احباب نے جس خلوص و گرم جوشی کے ساتھ استقبال کیا، ابھی تک وہ کہیں دیکھنے میں نہیں آیا، --- [۱۸ دسمبر ۱۹۶۰ء] سے سارا وقت تقریروں اور دعوتوں میں صرف ہو رہا ہے، تقریروں کا بھی ریکارڈ قائم ہو گیا اور دعوتوں کا بھی، تقریباً تمام تقریریں ریکارڈ ہوئیں، اور کئی کئی، ۹ جنوری کو ملک کے بالائی حصہ مانڈلے کا سفر پیش آیا، ۶ روز کا سفر تھا، بہت پُرلطف اور پُر راحت، جاپان کی بنی ہوئی گاڑیوں اور فرسٹ کلاس کے انتظامات دیکھے، بعض چیزیں قابل تقلید ہیں، ہر مسافر کو تولیہ اور صابن ریلوے کی طرف سے مستقل ہدیہ ہوتا ہے، چادر بچھانے کے لیے اور تکیے ریل کی طرف سے ملتے ہیں، مچھردانی بھی مل سکتی ہے، یہ سب واپس ہو جاتا ہے، تولیہ اور صابن رہ جاتا ہے، ہر کمپارٹ منٹ میں ریڈیو کا میکروفون ہے، اس سے ریڈیو پروگرام اور آنے والے اسٹیشن کی اطلاع ملتی ہے، وغیرہ وغیرہ '(صفحات ۲۵۶ - ۲۵۷)۔

اس کے بعد مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو بارہا بیرون ملک جانے کا موقع ملا۔ سید ابوبکر حسنی کے نام ۲ جولائی ۱۹۶۹ء کو لندن سے، اور ۳ جون ۱۹۷۷ء کو لاس اینجلس سے لکھتے ہیں، آخر الذکر

امریکہ و کینیڈا کا سفر تو اُن کے الفاظ میں ''الیکشن مہم'' کی طرح کا'' صحیح معنوں میں طوفانی دورہ'' تھا، جب ٹورنٹو میں افرادِ خانہ ان سے ملے تو تأثر تھا کہ: ''[وہاں] ٹونک یا بھوپال کا سا لطف آیا، پرانی یادیں تازہ ہوئیں'' (ص ۲۸۴)۔

ان مکتوبات میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے کہیں کہیں اپنی کتابوں کی اشاعت، ترتیب اور ان پر اپنے اور دوسروں کے تأثرات درج کیے ہیں۔ اپنے اندازِ تالیف و مطالعہ کے بارے میں بتاتے ہیں: ''بغیر مطالعہ و تیاری کے ہم سے کچھ لکھنا مشکل ہے۔ — یوں کسی علمی موضوع پر سرسری طور پر اور رواروی میں ہم سے کچھ نہیں لکھا جاتا'' (ص ۲۵۷)۔ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا مستقلاً اپنی ضرورت اور ذوق کی کتابوں کی تلاش میں رہتے تھے، اور اس سلسلے میں احباب کو تکلیف بھی دیتے تھے۔ سید ابوبکر حسنی کو ایک کتاب ''آؤٹ لائن آف ہندوازم'' کی فراہمی کے لیے کہتے ہیں (ص ۲۶۳)، اسی طرح ان ہی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں: ''مجھے ایک ایسی کتاب کی فوری ضرورت ہے جس میں حبیب بورقیبہ (تونس) کے متعلق کچھ معلومات [ہوں]، خاص طور پر ان کی پرائیویٹ زندگی، طرزِ رہائش، ذوق و معاشرت وغیرہ'' (ص ۲۸۹ - ۲۹۰)۔ ۱۹۸۴ء کے اس خط میں جو معلومات درکار تھیں، غالبًا وہ نہیں مل سکیں، کیوں کہ اس موضوع سے قریب تر کتاب ''مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش'' میں ایسی کوئی جھلک نہیں۔

مولانا نے اپنی تالیفات کے حوالے سے بطور جملہ ہائے معترضہ جو کچھ لکھا ہے، ان میں سے ایک دو تأثرات دیکھیے: ''حیات عبدالحی'' (دہلی: ندوۃ المصنفین، نومبر ۱۹۷۰ء) میں مولانا عبدالحی کی تالیف ''گلِ رعنا'' کا ذکر لازمی تھا، مولانا کے الفاظ میں ''گل رعنا والے حصہ کو مسعود حسن صاحب ادیب نے پڑھا اور 'آب حیات' کی صفائی میں خط لکھا، لیکن عہدہ برآ نہ ہو سکے'' (ص ۲۷۸)۔ اسی طرح مولانا کے اپنے بقول ان کی کتاب ''دریائے کابل سے دریائے یرموک تک'' بہت اہم ہے، ''پروفیسر رشید احمد صدیقی تو [اسے ان کی سب کتابوں] پر ترجیح دیتے اور کہتے تھے کہ یہ کتاب راشن سے پڑھنی چاہیے، یعنی تھوڑی تھوڑی'' (ص ۲۸۴)۔

ان مکتوبات سے مولانا کے اپنے اعزہ و احباب، معاصر اہل علم اور ملنے والوں کے بارے میں بھی ان کے جذبات و احساسات کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے برادر بزرگ اور سرپرست ڈاکٹر سید عبدالعلی (جن کے نام زیرِ نظر مجموعے میں مکتوبات بھی شامل ہیں) فوت ہوئے، تو مولانا وطن سے دور

سفر میں تھے، اس حادثے کے بارے میں اپنے ایک عزیز کو لکھتے ہیں: ''بڑا داغ دل پر یہ ہے کہ میں تدفین میں شریک نہ ہو سکا، ساری عمر دل پر یہ داغ رہے گا، وکان امر اللہ قدرا مقدورا، انتقال پر ان کی جو قبولیت و ہر دلعزیزی ظاہر ہوئی، اس کا تصور نہ تھا۔ --- جتنا وقت گزرتا جا رہا ہے، ان کے محاسن، ان کی شفقتیں اور ان کی برادرانہ نہیں، بلکہ پدرانہ تربیت و سرپرستی دل میں چٹکی لے رہی ہے، اور برابر'' (ص ۲۴۹)۔

مولانا مسعود عالم ندوی (م ۱۹۵۴ء) فوت ہوئے تو ایک ''ندوی'' بزرگ کو یوں اطلاع دی: ''مولانا مسعود عالم ندوی کے حادثۂ وفات کی اطلاع ملی ہو گی۔ ایک بڑا دوست اور ہندوستان کا عربی انشاء پرداز اٹھ گیا'' (ص ۲۳۶)۔ اگست - ستمبر ۱۹۵۵ء کے مکتوبات میں مولانا ابوالکلام آزاد کا ضمناً ذکر آیا ہے، مکتوبات کے ان جملوں کا پس منظر واضح نہیں، تاہم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا تأثر ایک حد تک سمجھا جا سکتا ہے۔ ایک خط میں یہ جملے ہیں: ''مولانا آزاد غالباً اب بھی اپنے خیال پر قائم ہیں، ان کو مطالعہ کا زیادہ موقع نہیں ملتا، اس لیے جو خیال قائم کر لیا، وہ باقی رہتا ہے'' (ص ۲۴۲)، جب کہ دوسرے مکتوب میں لکھا ہے: ''مولانا [آزاد] کے متعلق اس کے سوا کیا عرض کروں کہ حقیقت حال اللہ کو معلوم ہے، مورخ کو ان کے متعلق بڑی دشواری پیش آئے گی، 'غبار خاطر' پر سید صاحب [سید سلیمان ندوی] نے تبصرہ کیا تھا، اس سے کچھ اندازہ ہوتا ہے'' (ص ۲۴۳)۔

ستمبر - نومبر ۱۹۶۳ء کے سفرِ یورپ میں سوئزرلینڈ میں ڈاکٹر محمد حمیداللہ (م ۲۰۰۲ء) کا ساتھ تھا، ایک خط میں ان کی بے تکلفی، سادگی اور وسیع معلومات کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ڈاکٹر حمیداللہ صاحب نے بڑا وقت ہمارے ہی ساتھ گزارا، بے تکلف کمرے میں تشریف لے آتے ہیں، اور دیر تک بیٹھتے ہیں، عجب سادہ مخلص اور مسلمان آدمی ہیں --- ڈاکٹر حمیداللہ صاحب کی وسیع معلومات، وسیع مطالعہ اور یورپ سے [ان کی] واقفیت سے برابر فائدہ اٹھاتے رہتے ہیں'' (ص ۲۹۴)۔

جب چند دن بعد وہ اپنے مستقر پیرس چلے گئے تو ایک عزیز کے نام لکھا: ''[ڈاکٹر حمیداللہ] عجب درویش، مجاہد، سپاہی اور فنا فی العلم آدمی ہیں۔ اپنی بہت سی خصوصیات میں نادرۂ عصر اور بے نظیر آدمی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے اسی کام کے لیے پیدا کیا اور اسی کے لیے فرانس بھیجا ہے۔ خود اُن کا بھی یہی عقیدہ ہے۔ عجب زاہدانہ، بلکہ فقیرانہ زندگی ہے۔ ۱۵ - ۱۶ برس سے گوشت (مشتبہ ہونے کی وجہ سے) اور مچھلی انڈا (تجرد کی بنا پر) بالکل ترک کر رکھا ہے۔ سخت محنتی، جفاکش اور

بے نفس آدمی ہیں۔ ان کے جانے کے بعد کچھ تنہائی سی محسوس ہوئی، دوتین دن میں بڑا انس اور تعلق پیدا ہو گیا تھا" (ص ۲۹۷)۔

اور جب پیرس گئے تو مولانا کے الفاظ میں "ڈاکٹر حمیداللہ صاحب Air Terminus پر موجود تھے۔ انہوں نے ایک صاف ستھرے پُرسکون ہوٹل میں ٹھہرایا ـــــ وہی سب مصارف کے متکفل ہیں، کتنا ہی اصرار کرتے ہیں، مانتے نہیں" (ص ۲۹۸)۔

یورپ کے سفر میں علامہ محمد اسد، ڈاکٹر سعید رمضان، حسن ترابی (جو اس زمانے میں بطور طالب علم پیرس میں مقیم تھے) جیسے داعیانِ اسلام سے ان کی ملاقات رہی، وہیں محمد جان ویبسٹر (جو مسلمان ہوا، اور پھر مرتد ہو گیا تھا) کو ہائیڈ پارک (لندن) میں عربوں اور پاکستانیوں کی ہجو کرتے، اور اسلام کا تمسخر اڑاتے ہوئے دیکھا۔ لندن، اوکسفرڈ اور کیمبرج کی جامعات سے وابستہ مستشرقین سے ملاقاتیں بھی کیں۔ مستشرقین کے مطالعۂ اسلام کے بارے میں اُن کا تأثر یہ ہے:

ابھی تک جن مستشرقین سے ملاقات ہوئی، ان سے مل کر عام تأثر کچھ زیادہ بہتر اور بلند قائم نہیں ہوا۔ معلومات میں نہ زیادہ وسعت ہے، نہ گہرائی، غالبًا جس موضوع پر جس زمانہ میں کام کرتے ہیں، اس پر وقتی طور پر حاوی ہو جاتے ہیں، پھر چوں کہ اس کا ان کی زندگی سے تعلق نہیں ہوتا، اس لیے اس کا انحصار [کذا، استحضار] اور اس پر عبور معلوم نہیں ہوتا (ص ۳۱۳)۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دارالعلوم ندوۃالعلماء کے سربراہ تھے، اور اس لحاظ سے مسلمانوں کی تعلیم سے ان کا گہرا عملی تعلق تھا۔ سیکولر نظام تعلیم میں "اسلامیات" کا پیوند لگا کر یہ توقع رکھنا کہ اسلامی تصور حیات کی حامل نوجوان نسل وجود میں آئے گی، ایک خیالِ خام ہے۔ مولانا نے ایک مکتوب میں سعودی عرب کی درس گاہوں کے ذکر میں اپنا تجربہ و مشاہدہ بایں الفاظ بیان کیا ہے:

ترکی، مصر و ہندوستان میں قدیم و جدید علوم اور ایک ساتھ دینی و مدنی تعلیم کا تجربہ کچھ کامیاب نہیں رہا۔ لوگوں کو ان درس گاہوں سے بڑی مایوسی ہوئی جن کو اسلامی ادارے اور اسلامیہ کالج و مسلم یونیورسٹی کے نام سے قائم کیا گیا تھا اور ان پر مسلمانوں کی بڑی دولت اور قوت صرف ہوئی تھی۔ نتیجہ میں یہ ثابت ہوا کہ دینی اثرات مغلوب اور جدید تعلیم کے اثرات غالب اور نمایاں ہیں، اور ایک ایسی نسل پیدا ہو گئی ہے جو اسلام اور مسلمانوں کے لیے کچھ مفید نہیں، بلکہ بارِدوش ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ ان تعلیم گاہوں میں دین

کی نمائندگی کرنے والے غیر مؤثر اور کمزور تھے، اور ان میں ایسی شخصیت کی کمی تھی جو استاد کے لیے ضروری ہے، نئے علوم کی نمائندگی کرنے والے زیادہ تیار اور مؤثر تھے اور ان کی پشت پر نظامِ سلطنت، ایک زندہ تہذیب اور زمانہ کی قوت تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دینیات کی تعلیم تفریح کا گھنٹہ اور ایک مضحکہ بن کر رہ گئی، بلکہ اگر دینیات کی یہ تعلیم نہ دی جاتی تو طلبہ کو شاید حسنِ ظن رہتا، دین کی تعلیمات اور علمی تجربات میں ہرگز کوئی تناقض نہیں، اس لیے دونوں میں کشمکش کی کوئی وجہ ہی نہیں، مگر غلط نمائندے اکثر یہ کشمکش پیدا کر دیتے ہیں، دراصل علومِ جدیدہ کو اس طرح پڑھانے کی ضرورت ہے کہ وہ دین کے لیے معاون اور دلیل کا کام دیں۔ ---(ص ۲۱۰)۔

علومِ جدیدہ سے مطلوبہ مقاصد کا حصول کیسے ممکن ہے؟ مولانا کے الفاظ میں:

اس کے لیے ضرورت ہے کہ [علومِ جدیدہ] کی ازسرنو تدوین ہو، ان میں اسلامی روح کو داخل کیا جائے اور ان سے دینی نتائج و فوائد حاصل کیے جائیں، دینی و مدنی کی تفریق بالکل مٹا دی جائے۔ جو کچھ ہو وہ دینی ہی ہو، مختصر یہ کہ یہ نہ کیا جائے کہ پانی میں زمزم کے چند قطرے ملا دیے جائیں، بلکہ جو کچھ ہو وہ زمزم ہی ہو (صفحات ۲۱۱- ۲۱۲)۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے سنجیدہ قاری کو بعض اوقات مکتوبات میں بیان کیے گئے واقعات و تأثرات میں تکرارِ معلومات کا احساس ہوتا ہے، کیوں کہ یہ واقعات ان کی خودنوشت ''کاروانِ زندگی'' اور کچھ دوسری کتابوں میں مندرج ہیں، تاہم مکتوبات کے نجی اور بے تکلفانہ انداز نے ان واقعات کو عام کتابی اندازِ بیان سے زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے۔

جناب مرتب نے مکتوب الیہم اور مکتوبات میں مذکور بعض شخصیات کے بارے میں مختصر اور جامع حواشی قلمبند کیے ہیں، تاہم نسبتاً کم معروف اور بالخصوص پنجاب (پاکستان) کی شخصیات کے بارے میں کچھ نہیں لکھا جا سکا، ہری پور کی نواحی بستیوں ''چھوہر شریف'' اور ''درویش'' کے نام صحیح نہیں لکھے جا سکے (ص ۲۰ - ۲۱)۔ سید احمد شہید کی اوّلیں سوانح عمری ''مخزن احمدی'' کے بارے میں لکھا گیا ہے: ''یہ کتاب --- اب نایاب ہے (حاشیہ، ص ۲۲۲)، حالانکہ اس کی اوّلیں اشاعت کا عکس ۱۹۷۶ء میں مکتبہ حبیبیہ - لاہور نے شائع کر دیا تھا، اور یہ عکس پاکستان کی حد تک اچھے کتب خانوں میں بآسانی مل جاتا ہے۔

تھیوسوفیکل سوسائٹی کی متاد مسز اینی بسنٹ کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ ''وہ مسیحی سے ہندو ہو گئی تھیں'' (ص ۱۴۲)، حالانکہ وہ ابتداء یہودی تھیں نہ کہ مسیحی۔

کتاب میں بحیثیت مجموعی پروف کی اغلاط بہت کم ہیں، تاہم اگر یہ اغلاط ــــ ''مذاکرات سائح فی الشرق العربی (ص ۲۳۸، مذکرات سائح فی الشرق العربی)، ''مکاتپ سلیمان'' (ص ۲۴۰، ''مکاتیب سلیمان'')، امام صنعائی'' (ص ۳۰۹، امام صغانی) وغیرہ ــــ بھی نہ ہوتیں تو زیادہ بہتر ہوتا۔ کمپیوٹر کے آنے سے سرورق کے ڈیزائنوں اور بحیثیت مجموعی کتابوں کی تزئین کاری میں بہت اضافہ ہوا ہے۔ ''مکتوباتِ مفکر اسلام ---'' کا ٹائٹل چار رنگوں میں خاصا دلکش اور جاذبِ نظر ہے۔